باب ۷

امواجُ الاسماء

صفات الٰہی

ذات کا ادراک ناممکن ہے، ''الا'' ذات کے۔آگ کو آگ پہچان سکتی ہے۔ذات کو ذات۔ ذاتِ حق تک رسائی تو بڑی بات ہے، ایک انسان تک کی ذات کا ادراک ممکن نہیں سوائے اس کی اپنی ذات کے۔ دوسرے انسان کو جاننے کے لئے البتہ اس شخص کی پوشیدہ قوتوں کے عمل میں آنے سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ مشاہدہ اور علم میں آجاتے ہیں۔اور کچھ اس طرح اس کی ذات کا ادراک ممکن ہو جاتا ہے۔ان پوشیدہ قوتوں کو اس کی صفات کہہ لو اور انہیں نام دے لو۔اس طرح اس شخص کی ذات کا ادراک اس کے اسماء وصفات کے ذریعے ہو جاتا ہے۔البتہ ان مختلف صفات سے اس ذات کی وحدت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔اس شخص سے طرح طرح کے افعال ظاہر ہوتے رہیں تو اس کی وحدتِ شخصی تبدیل نہیں ہوتی۔ دیکھا جائے تو اسم اپنے مسمی کی خصوصیت بیان کرتا ہے، اور صفت اپنے موصوف کی حالت اور افعال بیان کرتی ہے۔اسماء کی اصل ربوبیت ہے اور صفات کی الٰہیت قابل غور بات یہ ہے کہ انسان تک کی ذات اپنے اسماء و صفات، جسمیّت اور مکانیت سے پاک ہے۔ مادہ، مدت، مقصد، حرکت اور قوت سے بھی مستغنی ہے۔

حق تعالیٰ کی صفت خالقیت، مخلوق کے وجود میں آنے سے پہلے بھی ظہور میں تھی۔البتہ مخلوق (مربوب) کے وجود میں آنے سے صفت ربوبیت پہچانی گئی۔حق نے جس صفت کو چاہا، جس پر چاہا، ظاہر فرمایا۔اس طرح صفات الٰہیت کا مختلف نسبتوں میں اظہار ہے۔اور رنگا رنگ مدارج میں خلقت میں ظاہر ہیں کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاۡنٍ، چونکہ افعال غیر متناہی ہیں، اس لئے اسماء وصفات غیر متناہی ہیں۔اس کے باوجود یہ ایک امتیازی کیفیّت رکھتی ہیں۔ایک کو دوسرے سے متمیز کرتی ہیں اور اسماء کی حقیقت کو قائم رکھتی ہیں۔

حق کے ان لامتناہی اسماء و صفات کا مرجع مقررہ اصولوں پر ہے جو ننانوے ہیں اور اسمائے حسنیٰ کہلاتے ہیں۔ان اسمائے حسنیٰ کا مرجع بھی سات اصولوں پر ہے جو امہات اسما ہیں۔''حَیّ'' ''عَلِیۡم'' ''قَدِیۡر'' ''مُرِیۡد'' ''سَمِیۡع'' ''بَصِیۡر'' ''کَلِیۡم'''' اور جن کا ظہور سبع صفات، حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، کلام میں ہے۔ان میں سے بعض بعض کے ساتھ مشتمل ہیں، زوجین ہیں، جیسے۔

حَیّ ''عَلِیْم''قَدِیْر''مُرِیْد''۔ یعنی جیسے حیات نہ ہوتو علم نہیں، قدرت نہ ہوتو ارادہ نہیں۔ ارادہ نہ ہوتو کلام نہیں، اسی طرح اسماء ضدین ہیں، یا اسمائے متقابلہ، جیسے ''مُنْعِم''مُنْتَقِم''قَابِض''بَاسِط''ضَارّ''، نَافِع'' اور ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَام'' ہیں، جو دو اسم سے حاصل ہوتے ہیں۔ دونوں جانب ان کا رخ ہے اور دونوں کے درمیان برزخ ہیں۔ جیسے ذُو القُوَّۃُ المَتِین۔ (متین روح اور وجود کے درمیان) اسی طرح اسماء کی ترکیب سے غیر متناہی اسماء پیدا ہوتے ہیں، جو حد شمار سے باہر ہیں۔ البتہ ان ساتوں اسماء کی حقیقت ایک ہی اصل کی جانب ہے، وہ اللہ ہے۔ یہ اسم جامع ہے، تمام اسمائے الٰہی اور صفات الٰہیہ کا۔

اسمائے الٰہی جن صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، وہ مظاہر اسماء کہلاتے ہیں۔ عالم مثالی میں وہ صورت یا مظاہر ہیں، جن میں اسمائے الٰہی، علم الٰہی میں ظاہر ہوتے ہیں، اور عالم شہود میں وہ وجود عینی کہلاتے ہیں۔ اس طرح خلقت کی ہر شے مختلف اسماء کی ترکیب کی ایک ظہوری صورت ہے۔ انسان کو لیں تو اس کی روح ذات کا آئینہ ہے۔ مجمل انداز میں ذات کی تجلّی ہے۔ جب روح نے ارادہ کیا تو اس سے جو فعالی حرکت پیدا ہوئی اس کا نام قلب ہے۔ اسی نکتہ سے دائرہ موجودات گردش میں آیا ہے۔ قلب اس فعالی حرکت سے اسماء وصفات کا آئینہ بنا، اور عالم حق میں اسماء وصفات کی جدا جدا تجلی کا مادی صورت میں اظہار ہوا۔

حدیث مبارک ہے کہ جس نے ۹۹ ناموں کی حقیقت پالی ہو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اس حقیقت کا پانا علم الیقین یا عین الیقین تک کی بات نہیں، بلکہ حق الیقین کی بات ہے۔ جاننا ہو جانا ہے اور یہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ کسی شخص کو خود اپنی صفات کا اپنے پر عیاں ہونا ظاہر ہوتا ہے، کہ زندہ ہے۔ علم رکھتا ہے، قدرت رکھتا ہے، ارادہ رکھتا ہے، دیکھتا ہے، سنتا ہے، بولتا ہے۔ یہ عرفان اجمالی طور پر اپنی یکتائیت میں حاصل ہوتا ہے۔ یعنی ایک وحدت ذات میں، اپنے عرفان ذات تک رسائی ہوتی ہے۔ اس لئے ذات کے عارف کو موحد کہتے ہیں۔ دیکھا جائے تو صفات کے ہیرے جواہرات زیادہ تر لوگ چنتے ہیں، وہ بھی ذکر، اذکار، تجلی، انوار اور انعامات کی شکل میں، اپنے سے جداگانہ چیز سمجھ کر، ایک قسم کی دوئی میں۔ مگر اصل چیز ذات ہے۔ ذات کے لئے بغیر تعین کے حقیقت نہیں آتی بغیر وجود کے بات نہیں بنتی۔ ذات کا سمونا بڑا احسان ہے اللہ کا۔ اس کے لئے اپنے کو فراموش کر دے۔ اور کسی ذات مقدس میں گم کر لے۔ کسی قلندر نے کیا خوب کہا ''اے اسماء کے چکر میں گرفتار مسٹی کو کیوں نہیں ڈھونڈتا''۔ یوں ہم لوگ عام طور سے کوئی اسم مل جائے تو کسی مقصد کے لئے پڑھتے ہیں، اسے آلہ بناتے ہیں۔ یہ بڑی ذلت ہے۔ اسم تو نشانی ہے، آیت ہے۔ اس نشانی کے پس پشت جو حقیقت ہے اس تک پہنچنا ہے۔ چشمِ دل وا ہو تو ایک ایک

اسم کا عالم وجود میں کوئی نہ کوئی پیکر مل جاتا ہے۔مگر جس پر نہ بیتی ہو وہ کیا جانے کہ جیتے جی حقیقت تک نہ پہنچیں تو سب جنجال ہے۔ یہ لطافتوں کی باتیں ہیں۔ لطافت کے لئے ایک مثال لیں۔کوئی کئی دن کا بھوکا ہے، اسے کھانا کھلایا۔ وہ الفاظ کے ذریعہ کہتا ہے کرم کیا۔ اب یہ کرم اتنی نازک چیز ہے جو نہ کھانا تھا نہ پیٹ بھرنا۔اسی طرح کسی سے عشق ہوگیا تو خیال بہلانے کے لئے کبھی آنکھوں کا تصور، کبھی آواز کا، کبھی قد کا۔مگر کیا عشق ان چیزوں سے ہوا ہے۔عشق تو ایک جلوہ سے ہوتا ہے۔ یہی قصہ ہے صفات اور ذات کا۔ ہم مادہ میں ہیں اس لئے ان لطافتوں کا اظہار مادی وسیلوں سے ہی ہوتا ہے۔ جیسے پھول کو دیکھے بغیر نہ نزاکت کا احساس ہوسکتا ہے، نہ خوشبو کا اور بات کچھ ایسی ہے کہ کسی ہستی سے عشق کے بغیر ذات تو دور، صفات تک کی بھی بھنک نہیں لگ سکتی۔

عشق نبیؐ کو خوشبو

عشق کی بات یہ ہے کہ انسان اوّل اوّل اپنی حس وحرکت سے، محسوسات اور ظاہر اجسام کا ہی قرب تلاش کرنے میں مطمئن ہو جاتا ہے۔ جب اس حالت سے ترقی کرتا ہے تو عقل کا نوراس میں چمکتا ہے۔اور بلاحرکت بدنی عالم بالا میں تصرف کرنے لگتا ہے، اعلیٰ صفات میں قدم رکھتا ہے۔ جیسے ایثار، قربانی، صداقت، خدمت، پاکی، طہارت وغیرہ اوران امور کا ادراک کرنے لگتا ہے جو قرب و بعد مکانی سے برتر اور ماوریٰ ہیں۔حرص و ہوا، شہوت، غضب کے تنگ تاریک کوچہ سے اسے آزادی ملتی ہے۔ عاقبت بینی، طلب کمال کی اس میں رغبت ہوتی ہے اورفرشتوں سے مشابہ ہو جاتا ہے۔ گویا جب انسان نفس، خیالات اورمحسوسات کو ترک کرے ان امور کے ادراک سے مانوس ہو جاتا ہے جو حس وخیال سے بالاتر ہیں تو مجردات میں اٹھالیا نہ جائے اس وقت نبی کریمؐ کی خوشبو نہیں ملتی عالم جبروت میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔اب وہ حسن کو بغیر حسین کے دیکھتا ہے اور اب کہیں سبحان اللہ کہنے کا مصداق ہوتا ہے۔ یعنی مقام ملائک میں قدم رکھتا ہے۔اسماء کا مقام بھی ملکوت تک ہے۔ جب تک ملکوت سے جبروت میں ''رحمت اللعالمینؐ'' ہے، محبوبیت ہے، امر ہے، ملکوت میں عالم عمل ہے، عالم جبروت تک رسائی اپنے اختیار اپنے مجاہدوں اپنی قربانیوں کی بات نہیں۔ یہ کرم تو ادھر سے ہے کہ اس نے چاہا تو اٹھالیا، عاشق کو محبوب بنالیا، گلے لگا لیا۔کوئی دوئی باقی نہ رہی۔اب کہیں مرضی تخلیق کی تکمیل ہوئی۔

اسی لئے انسان کو عَلَّمَ الْاَسْمَاءَ خَلیفۃ اللہ بنایا ہے۔ یہ حکم، امر وہی امانت تھی جو عطا ہوئی اوراسی امانت کو واپس کرنا ہوگا۔

امانت یہی خود ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ قیام خودی کا اقرار ہے۔سجدہ، اسی خودی کو حوالے کر دینے کی نشانی ہے۔ یہ امانت کچھ ہیرے کی طرح سمجھ لیں کہ اسے غلاف میں کیا رکھنا۔ دوسروں کو بھی نظارہ کرادیا۔ یا چراغ کی مثال، کام کرلیا چراغ واپس کر دیا۔ اپنا وجود ہی حق ہے، اس کے علاوہ ہے کیا۔اس لئے سیدھا سا نسخہ ہے کہ اپنی خودی کو 'تو' میں ضم کر دو۔ زندگی کا کام جو سپرد ہوا ہے، وہ کرو۔ ''دل بہ یار دست بہ کار'' اس میں ایمان و عمل دونوں شامل ہیں۔اس 'میں' اور 'تو' کی توحید میں ہی بارِ امانت اٹھایا جاتا ہے۔ ایک ہاتھ تیرا ایک میرا۔ایسی اکائی کی ضرورت ہے۔ یہ تھی نعمت جو اسلام نے دنیا کو دی۔ تعینات سے ماوراء مجردات میں زندگی گزارنا ہی اسلام کا باطن ہے۔ ''اَلْحَقُّ مَحْسُوْسٌ وَالْحَقُّ مَعْقُوْلٌ'' والی بات ہے۔بغیر عشق و محبت کے ان لطافتوں تک رسائی ممکن نہیں۔فطری طور پر انسان میں محبت کا جذبہ ہے۔محبت کی ابتداء خلش ہے، تجسس ہے، روح کی تڑپ ہے، اپنے اصل کے لئے۔ اسی لئے کسی قلندر نے کیا خوب کہا کہ جب تک نسبت ابراہیمی پیدا نہ ہو، قرآن تو بڑی چیز ہے کلمہ تک پڑھنا جائز نہیں۔ یہ تلاش حقیقت روح کی طلب ہے، ضرورت ہے، اس کی فطرت میں، یہ اپنے اصل سے وصال کی بے چینی ہے جو ہر زی روح کی فطرت میں ودیعت ہے وہ اپنی ظلمت اور جہالت کی وجہ سے اس تڑپ اور بے چینی کو خواہشات ،جسم سمجھ کر اسی کے حصول کی طلب میں زندگی گزار دیتا ہے اور روح ویسی کی ویسی تڑپتی رہ جاتی ہے۔

عاشق کے ہر قدم شوق کی ابتداء بسم اللہ ہے۔اور یہ نشانی ہے کہ حق سے رابطہ کا جو فطری شوق ہے وہ نہ ٹوٹنے پائے، اس کی یاد دہانی ہوتی رہے۔ ''بسم اللہ'' کی مثالیں لیں۔ بسم اللہ ہر سطح پر ہے، ہر عمل پر ہے، ہر قدم پر ہے، بسم اللہ نہ تم خود کر سکتے ہو بغیر حق کے، نہ ''بسم اللہ'' تم سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ اس بسم اللہ میں تم اور حق دونوں شامل ہیں۔ یہ تو مقناطیس کے دو قطب یا زوجین کا سا تقاضا ہے یہ ہی مثال زوج اسماء حسنہ کی ہے کہ ایک قطب ذات حق ایک قطب تم اب اسماء حسنہ کے معنی بھی ہوئے، اظہار بھی ہوا، عمل بھی ہوا اور اسی حالت میں علم الاسماء، خلقتہ اللہ کہلانے کے مصداق بنے بسم اللہ ساتھ نام اللہ کے کس کا ساتھ وہ کڑی تم خود ہو۔

دونوں ہاتھوں سے تالی بجتی ہے صرف اللہ کہنے میں دوری ہے۔اسی لیے کہتا ہے کہ من و ساقی بہم و سازیم جب تک یار ساتھ نہ ہو بات نہیں بنتی ۔ یہ ساتھ آتا ہے من و ساقی بہم سازیم کی سادگی سے اس میں عشق کی بھی انتہا ہے۔ تیرے بغیر میں کوئی چیز نہیں نہ میرے بغیر تو۔ دور لکھنا آنکھ کا فتور ہے۔خیال کریں تو درہ خیبر حضرت علیؓ نے اللہ کہہ کر نہیں اُکھاڑا بلکہ بسم اللہ یں حق

ساتھ ہے۔حق اندر ہے۔میرا جسم عمل کا میدان ہے۔کوئی دوئی نہیں میرا رخ ایک ہی جانب ہے۔حق کی جانب اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن غور سے دیکھیں تو زرہ زرہ کی صلاحیت مقناطیس کی طرح یہی ہے کہ اُسی حق کی طرف رُخ کر لیتا ہے اور اسی لیے اسم میں بڑی حقیقت ہے۔میرے اور اللہ کے درمیان اسم کا وہی مقام ہے جو حق اور نبی کریمؐ کے درمیان حضرت علیؑ کا ہے۔عَلِیٌ بَابُھَا۔حضرت علی سے یہ سلسلہ شیخ تک پہنچا۔محبوب کے اسماء اور صفات کی تجلی پا کر وہ تعلق قائم ہوا۔نار رفنا کی منازل طے کر کے شیخ ، رسول، اللہ کی توحید کو بقا ملی۔عرف نفسہ میں اوتو کا رابطہ ہوا۔میری مجازی صفات یہ حقیقی صفات کی تجلّی ہوئی اے بقائے تو جواب یہ سوال میں اور تو ایک ہوئے تو رہ گیا تو تو کہنا بھی روہٗ ہوئی۔بس 'ہے' کی کیفیت اس مستی میں سب حقیقت ایک ہے گویا ایک ہی لفظ ہے جو حقیقت کی جان ہے۔یہ لفظ ''ہے'' ہے تو ہے نہیں تو نہیں ہے جو سمجھو وہی ہے اور 'ہے' حق در حق ایک مستی سی ایک کیف سا۔اللہ ہو۔کیف میں آؤ وہی ایک 'ہے'۔اس ہے کا جو انتہائی شعور میں ہو سکتا ہے۔وہ ہے نورِ محمدیؐ، کن سے پہلے بھی یہی نورِ محمدیؐ جاری و ساری ہے۔فیکون خود ایک رحمت ہے، رحمت العالمینی تجلی ہے۔اس انوار رحمت، نورِ محمدیؐ کا کوئی وجود بھی نہیں ہے کیونکہ عالم تمام ذات باری کا علم ہے۔یہ اس علم سے بھی پہلے کی چیز ہے، ھُوَ الْاَوَّل حق کا وہ جلوہ جو ہے، وہ ہے، نورِ محمدیؐ۔چونکہ ہم وجود میں ہیں، اس لئے اس نکتہ کو ہی پکڑنا پڑتا ہے۔ہم پکڑیں یا نہ پکڑیں، وہ ہمیں ضرور پکڑتا ہے۔ رحمت سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے۔یہ اِلَّا بِسُلْطَان والی بات ہے۔بغیر سلطان کے ساتھ واقعی وہ بات ناممکن ہے۔اللہ کو ہم نے بت بنا کر اٹھارویں آسمان پر بٹھا رکھا ہے۔حقیقت کی سطح سے دیکھیں تو دوری اور دوئی کا سوال ہی نہیں ہو سکتا۔جب وُسِعَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ ہے جو 'ہے' کا شعور آجائے تو 'میں' ہے 'تو' ہے وغیرہ سب الفاظ ختم ہو جائیں۔نورِ محمدیؐ کی تجلی تو ذرّہ ذرّہ میں ہے۔ جب اپنا آئینہ صاف ہو گیا تو پھر خیال، امر سے تعلق رکھتا ہے۔اس کے آگے نہ خیال ہے ، نہ امر۔اس کے آگے بس 'ہے' ہی 'ہے' اس 'ہے' کے شعور کو عرفان کہتے ہیں۔'ہے' کی بھی بس واردات ہی ہوتی ہے۔کسی مجذوبہ نے کسی دہریہ سے پوچھا 'ہے'۔ اس نے سوچا خدا کا پوچھتی ہے۔کہا ہوگا اس نے پھر کہا 'ہے' تو دہریہ نے خیال کیا اور کہا کہ ''ہونا تو چاہیے وگرنہ یہ سارا دھندا کس لئے'' مجذوبہ نے تیسری دفعہ کیا، 'ہے' تو اب عرفان ہوا اور وہ شخص اور مجذوبہ دونوں مل کر ہے ہے ہا ہا ہا کرنے لگے۔ پھر جب یہ واقعہ اس دہریے نے مجھے سنایا تو یہی کیفیت میری اور اس کی ہو گئی اور اس آواز کا اثر میری بیمار بیوی پر جو دوسرے کمرہ میں تھی یہ ہوا کہ اس نے کہا ''آپ کتنے عرصہ سے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے' اب پردہ اٹھ گیا۔اب میں سب کچھ سمجھ گئی''۔اور بات بھی یہی ہے کہ حقیقت وارد ہی ہو سکتی ہے۔سمجھنے، سمجھانے کی بات نہیں۔یہی حال اسماء و صفات کا ہے۔

اسماء کا چکر بھی عجیب ہے۔ پڑھنے پڑھانے میں گھر گیا تو ہزاروں سال عمر بھی کافی نہیں۔ انہیں جھٹک ڈالنا چاہیے۔ اگر چہ لذیذ نشہ ہے۔ یوں اسماء کا ورد رکھنے میں کم از کم اتنا تو ہر ایک کو ہو جاتا ہے کہ جیسے گڑ گڑ کہنے میں منہ میں مٹھاس آجاتی ہے۔لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اسم مسمّٰی سے ذرا سا ہی حجاب ہے اور اسم پڑھنا نہیں اپنانا ہے، ہو جانا ہے۔اپنی جان اور روح کی تڑپ کی طرف انسان غور سے استغراق حاصل کر لے تو نہ صرف اسماء کی معنویت بلکہ حقیقت طاری ہوتی ہے۔ یہ علم الاسماء کا مقام ہے۔ اس فضل وکرم کا کچھ ایسا حال ہے کہ غوطہ لگانے کی بات ہو پھر اُس بحرِحقیقت میں کیا ہوتی نہیں۔

عقل کی سطح سے اسمائے الٰہی کو سمجھنے کے لئے انسان کو ہی لیں۔کسی انسان کو نام سے،صورت سے پہچانتے ہیں۔اسم کا تعلق تخیل تک ہے، اور اسم سے آگے صورت ہے۔ پھر اس کے آگے حقیقت ہے،صورت کیا ہے؟ ماحول اور 'میں' کے درمیان برزخ ہے۔ یا ظاہری حواس اور باطنی شعور کے درمیان برزخ ہے۔حقیقت میں اس سے آگے کی بات ہے۔ برزخ شیخ ہر آن ہے۔ یہی برزخ کبریٰ ہے۔اپنے نکتہ کی آئینہ شیخ میں دید ہے۔اس سے پار ہوئے تو روح۔ وہاں عالم امر ہے۔روح کی جو کھوج ہمارے وجود میں چھپی ہوئی ہے اس کا پرتو خیال ہے۔اس کا عکس عقل جزوی پر پڑتا ہے۔عقل جزوی عالم اسباب کی پابند ہے اس لئے کسی تشفی بخش انجام تک نہیں پہنچاتی۔یہی خیال جب قلب میں اتر جائے تو اسے ایک رخ مل جاتا ہے، اور بھٹکتا نہیں۔قلب میں خیال اترنے کی دو ترکیبیں ہیں، جو کسی کانٹے سے اٹک جانے سے تعلق رکھتی ہیں یا تو ٹوٹا ہو دل یا احسان میں ڈوبا ہوا۔ٹوٹے ہوئے دل سے بھی حق کی روشنی مل جانے کی امید ہو سکتی ہے۔ گو کہ غم میں شکایت کا جزو ہوتا ہے، مگر خوش نصیب ہے وہ جو کسی احسان میں اٹک جائے، تا کہ اٹھا لیا جائے۔فرمان ہے، جو شکر کرتے ہیں۔انہیں ہم بہت دیتے ہیں۔ نبی کریمؐ سے پوچھا آپ اتنی نماز کیوں پڑھتے ہیں۔فرمایا، کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔احسان ہی سب سے لطیف تر ذریعہ ہے، اٹھا لئے جانے کا۔احسان میں ہی حسن کی آنکھ کھلتی ہے۔احسان کھلا ہوتا ہے، شگفتہ ہوتا ہے۔

؎ گر عشق نبودے و غمِ عشق نبودے
حسنِ ازلی پردہ زرخ پر نہ کشودے

احسان کے پیر قلب میں ہوتے ہیں اور بصیرت روح میں۔احسان کی قبولیت کی صلاحیت ان میں ہوتی ہے، جن میں انسانیت کی صلاحیت ہو، ورنہ جانور بھی ٹوٹ کے رام ہو جاتا ہے۔سب سے بڑا احسان، وجود ہے، ورنہ ہم فرشتوں کی طرح بس اللہ اللہ کرتے رہتے ہے۔ وجود، یوں احسان ہے کہ وجود نہ ہوتا تو نائب نہ بن سکتا۔اور اس عالم کار زار میں اس کی آئینہ داری

نہ ہوسکتی۔ کتنا بڑا احسان ہے کہ وہ ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم'' ہے۔ رحیم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ رحمٰن بے وجہ، بے ضرورت، بے اہلیت اور ہر مخالفت کے باوجود دیتا ہے۔ رحمانیت ہر چیز پر غالب آجاتی ہے۔ چاہے ہزار کثافتیں ہوں، ہزار ناامیدیاں ہوں۔ یہ ''رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ'' کا احسان ہے۔ اس احسان کو جس نے قبول کرلیا، اس کے لئے نہ کسی بھٹی سے گزرنا ہوتا ہے نہ منزل۔ وہ تو موج ہی موج ہے، پھولوں کی سیج۔ اس نے دامنِ رحمت پالیا ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ دامن کبھی نہیں چھوٹتا۔ یہ ہے اصل چھوٹا راستہ احسان کا، وگرنہ بہت سے بھاڑ جھونک کر بھی پھنک جاتے ہیں، یا غموں رنجوں میں ڈوب جاتے ہیں، ٹوٹ جاتے ہیں، کوئی ایک سمندر ہوتا ہے جو بچ کر نکل جاتا ہے۔ جس نے رحمت اور احسان کو قبول کرلیا، وہ خوش نصیب ہے۔ جو کھونٹے سے لگ جائے وہ کیسے سوکھ سوکھ کر مرسکتا ہے۔ اس سے کیا چکی پسوائیں گے یا پسے گی، محبت کا انعام ہے، جب محبت بے وجہ ہو، خودبخود ہوتو محبت ہے۔ اسی طرح رحمت کی صفت ہے کہ بے وجہ رحمت۔ رحمت اور محبت ہم معنی ہیں۔ فرد کی سطح پر محبت اور اس کا عالم میں پھیلاؤ رحمت ہے۔ رحمت کی مثال دھوپ کی سی ہے کہ اندھیرے میں بیٹھے رہے تو دھوپ کہاں سے ملے۔ رحمت کے امیدوار اسی وقت ہو سکتے ہیں جب شکرگزار بنو۔ جیسے دولت، دولت کو کھینچتی ہے، اسی طرح شکر رحمت کو۔ بِسْمِ اللہ کی طرح یہ رحمت دوطرفہ حساب ہے، ظلمتوں میں یہ اس لئے نہیں آتی کہ روشنی اس کی سواری ہے۔ یہ روشنی لگاؤ، عشق، شکر، قربانی ہے۔ یوں اچھے اچھے طریقت والے بھی ظلمتوں میں گھرے ہوتے ہیں۔ انہیں رحمت کس طرح نصیب ہو، جب نہ عشق ہے نہ شکر، نہ ایثار ہے، نہ قربانی۔ جب کسی مرکزِ حق کے طفیل عشق کی پھریری آجائے تو وہ دیکھنا مَازَاغَ الْبَصَرُ ہو جاتا ہے۔ وہ بولنا، وہ سننا، وہ بات کرے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا۔ وہ سونگھنا وہ کہاں پھیلی ہے خوشبو اور یہ گیسو کہاں تک ہیں، وہ لامسہ، وہ چھونا آگ کا آگ کو، وہ جاننا رب کا رب سے، وہ چھلکنا لذتِ عشق کا، جام دیدار کا، جام وصال کا۔ جام شہادت کا۔ یہ لطافتوں کی دنیا ہے۔ صفات الٰہی کی لطافتوں کا پرتو ہے جو اجسام انسانی پر پڑ رہا ہے۔ صفات الٰہی کے انوار ہیں جن کی تابانی رنگا رنگ انداز میں اسی وجود سے ہوتی ہے۔ صفات اور وجود سے ہی ذات کا ادراک ہوتا ہے۔ اس رنگ میں توحید کو پانا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ اسماء و صفات زوج میں آئے ہیں۔ ایک پدری صفت ہے ایک مادری۔ یہ مقناطیس کے دو قطب جیسے ہیں۔ ایک مثبت ایک منفی۔ حقیقت میں یہ جدا نہیں ہو سکتے۔ ایک قطب کے عملی معنی ہی نہیں ہوتے۔ دونوں جب ملیں تب ایک جیسے الرحمٰن (پدری) الرَّحِیْم (مادری) ''غَفُوْرٌ، رَحِیْمٌ، سَمِیْعٌ، عَلِیْمٌ، جَبَّارٌ، قَهَّارٌ، حَیٌّ، قَیُّوْمٌ'' انسان، خود جوہر لطیف ہے۔ اسماء کی لطافتیں، اپنا کر لطافتوں میں قیام کر لے، الطف ہو جائے تب مظہر انوار بنے۔ مثلاً جب حَیٌّ میں زندگی، قَیُّوْمُ میں قیام ملا، تو انوار نے گھیرا، سایہ نور میں آئے۔ جب حق جلوہ گر ہوا تو رائی کے دانے کی طرح وجود پھٹ گیا، پھر پھیل گیا پانی کی طرح اس میں احساس باقی

رہا، کہ حضورؐ ہیں، پھر شعور آیا، جیسے بچہ ہو گیا۔ پھر کہالَا اِلٰہَ اِلاَّ اللہ، توحید میں قدم رکھا، توازن میں آئے۔ یہ زوجین ضدین سب توازن میں ہیں۔ منفی مثبت دو قطب، اگر چہ مقناطیس خود واحد ہے۔ مقناطیسیت کی طرح عمل کی جو برکات یا شعائیں یا نور ہے، وہ بنتا ہے ان ہی دو سے ہے اور عمل کے معنی ایک 'میں' ایک 'تو' ایک ہاتھ میرا ایک تیرا۔ دونوں ہاتھ سے تالی بجتی ہے، اس لئے اس حَیُّ کو خلوص سے پکڑو جو زندہ موجود ہے۔ خلوص میں حَیُّ والی زندگی اور تڑپ ہوتی ہے، وہ نمو کی بے قراری۔ تم اللہ اکبر کہہ کر بھی جیسے کے ویسے۔ مرغ جیسے بھی نہیں کہ اللہ اکبر اور جاں بحق۔ زندگی کی اس شدت کن کو اپناؤ۔ کائنات کی ذرہ ذرہ بے پناہ حرکت نمود کے جوش میں مشغول ہے۔ یہ بھی ارتقاء کی طرف رجوع کرتا ہے، جامد نہیں ہے۔ تم بھی حَیُّ کے کیف میں ہو کر حرکت نمود میں آؤ، حیاتِ جاودانی میں قدم رکھو۔

اس طرح اسماء حسنہ میں سے قہار و جبار کو لیں۔ قہاریت، جباریت، پیاری چیز ہے، تجلی، ہے، زندگی ہے جیسے روضہ مبارک کی جالی پکڑلی، بوسہ بھی نہ دے سکے۔ اپنا خیال تک اس قہاریت حسن میں نہ رہا، عشق سمٹ کر آنکھوں میں آ گیا۔ ایک کھوئی کھوئی سی حالت۔ یہ ہے خشیت حسن، آنکھوں کی ٹھنڈک۔ یہ زمان سے نجات کی حالت ہے۔ اس وجود سے دوری ہو تو اپنی حقیقت سے قرب ہوتا ہے۔ لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ۔ جب سب الٰہ مٹ جائیں تو اللہ خود ہے۔ ہر دم ہے اس لیے کہا ہے میں دہر ہوں۔ دہر کو ہر اُمت کہو۔ اِس کیفیت میں رہنا بڑی بات نہیں۔ اِس دریا کو اپنے میں سے تیرانا چاہیے۔ خواہ دریا زمان کا ہو یا مکان کا یا زندگی کا ایسے ہی تقدیر اور تدبیر کا زوج ہے۔ تقدیر آسمان ہے تو تدبیر زمین ہے تقدیر زمین ہے تقدیر باپ ہے تو تدبیر ماں ہے دو میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنی ایک کائنات آپ ہے لیکن اس زوج میں کوئی دوئی نہیں ان کے وصل سے زندگی کی تگ و دو آرزوئیں تمنائیں تڑپ اور بیقراری اپنے مال تک پہنچتے ہیں۔ تقدیر کا ایک ادنیٰ سا نقطہ ہوتا ہے۔ جو تدبیر کی زمین میں پرورش پاتا ہے اور بس بضد تکلیفات دیتا ہے۔ ادنیٰ سا نقطہ ہے لیکن بغیر اس کے اعمال بے ثمر ہوتے ہیں زوایہ نگاہ سے عورت اور مرد کی فطرت سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ انسان اپنے وجود پر ہی غور کرے تقدیر اور تدبیر کی صلاحیت استعداد خود اس کے زرہ زرہ میں موجود ہے۔ جس عزم مقناطیس کے قطب جدا نہیں کر سکتے اسی طرح تقدیر اور تدبیر جفت میں میں البتہ یہ خیال ضرور گزرتا ہے کہ آخر جو مقدر میں نہیں ہے ہم اُس کے لیے کیوں کوشش کرتے ہیں اور نا کام رہتے ہیں یہ بات ایسی ہے جیسے غیر شادی شدہ عورت بے ثمر رہا مقدراتِ ملت یا انسانیت تو یہ بھی وہی بات ہے۔ جیسے شہد کی مکھیاں ہزاروں ہوں۔ مگر ایک چھتے کا نظام ایک واحد جسم کی طرح اپنی انفرادیت الگ رکھتا ہے۔ اسی طرح ملت خود ایک جسم کی طرح ہے اور انسانیت اور کل زندگی جس میں چرند پرند سب شامل ہیں وہ ایک نفس کل ایک جسم کی طرح ہیں۔ اُن کے

مقدرات اور تدابیر اجسام میں خود موجود ہیں البتہ جیسے حاکم کے حکم پر خلقت عمل پذیر ہوتی ہے اسی طرح امر مرکز تقدیر ملت ہوتا ہے۔ اور وہ جو کل انسانیت امر ہوتا ہے وہ قطب الاقطاب کہلاتا ہے اور کل زندگی یا نفس کل کا مرکز ذاتِ نبی کریمؐ ہے جو جاری و ساری ہے۔

ایمان کو لیں، تو ایمان اپنی جگہ ہے۔ خود واحد ہے، مگر عمل کی جو برکات یا شعاعیں یا نور ہے وہ بنتا ہی انہی دو قطبوں سے ہے۔ یعنی ایمان و عمل، ایک مثبت ایک منفی، ایک 'وہ' ایک 'تم' اسی طرح انسان کے جتنے اعلیٰ اقدار ہیں وہ تمام واحد ہیں۔ جیسے محبت، کا زوج، نفرت ہو سکتا ہے، مگر عشق کا نہیں۔ کنجوس کا خیرات ہو سکتا ہے، مگر سخاوت واحد ہے۔ بزدلی، اور شجاعت زوجین ہو سکتے ہیں، مگر شہادت واحد ہے۔ ولایت و نبوت زوجین ہیں مگر توحید واحد ہے۔ نفس، منفی صفت ہے، قلب مثبت چیز ہے، مگر روح واحد ہے۔ خیر شر زوجین ہیں، مگر رحمت واحد ہے۔ ان سب کو ہاروت و ماروت کے پیکر میں دیکھیں اور غور کریں کہ آخر یہ زوجین انسان کے اندر کیوں ڈالی گئی ہیں وجہ یہ ہے کہ مادری پدری صفت ربوبیت کی شان ہے۔ اور مثبت منفی ملا کر ایک، ہو جاتا ہے۔ اللہ ایک ہے۔ اس روشنی میں زوجِ اسمائے حسنہ کو ایک ایک کر کے غور کریں تو صفات کی وہ تجلیاں ہوتی ہیں کہ قلب و روح جگمگا اٹھتے ہیں۔

عالمِ امکان کا سب سے نمایاں زوج دن اور رات یا روشنی اور تاریکی ہے۔ ارتقائے زندگی پر غور کریں تو شاید زندگی اور جان کے ہزاروں اقسام اسی روح کے بغیر وجود میں ہی نہیں آتے۔ البتہ سمندر کی تہہ میں کوئی پانچ چھ میل کی گہرائی میں جہاں بظاہر کلی تاریکی ہے، وہاں بھی مچھلیوں کی کچھ اقسام ضرور پائی گئی ہیں۔ اسی طرح ممکن ہے زمین میں بھی، غاروں میں، تاریکیوں میں کچھ زندگی کے نمونے ضرور ہوں گے، مگر جب ارتقاء کی کڑیاں ہم دیکھتے جائیں تو اعلیٰ مخلوق جو بنی ہے، سب اسی زوج کے بوتا پر بنی ہے۔ جس طرح زندگی پہلے سمندر سے رینگ رینگ کر خشکی کی طرف آئی، اسی طرح ممکن ہے کہ یہ تاریکی کی مخلوق بھی وقت گزرنے پر طبعاً روشنی کی طرف نکل آئے۔ ایک درخت کی مثال لیجئے، روشنی اس کو اوپر کھینچتی ہے۔ جسے (ہیلو ٹراپزم) Heliotropism کہتے ہیں۔ اور تاریکی جڑوں کو اور زمین میں پیوست کرتی جاتی ہے جیسے geolxopiosion کہتے ہیں۔ درخت اپنی نشونما کے لئے اپنی غذا زمین یا تاریکی سے ہی لیتا ہے۔ مگر وہ اس کو ہضم نہیں کر سکتا، جب تک کہ سورج کی روشنی اور ہوا کے اجزاء اس غذا کو حرکت میں نہ لائیں۔ کائنات میں خیر و شر کی یہی رمز ہے۔ جب تک کسی انسان میں شر کی صلاحیت نہ ہو یعنی نفس قوی نہ ہو، وہ کبھی اعلیٰ مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتا کوئی نامرد یا ہیجڑا نہ آج تک ولی ہوا۔ نہ کوئی جرنیل نہ

کوئی اعلیٰ کردار ادا کر سکا۔اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہی نفس یا حرارتِ غریزی کیسے مسلمان ہو۔ کیسے کسی فرد کے نصب العین کے ساتھ ہم آہنگ ہی نہیں بلکہ معاون اور مددگار ہو۔ نبی کریمؐ نے اس کا نہایت سادہ نسخہ بتایا ہے۔ایک بہت غریب نوجوان حاضر ہوا، اور کہا کہ یا رسول اللہؐ میں بہت غریب ہوں، اور شادی کی مجھے ضرورت ہے۔مگر شادی نہیں کرسکتا۔ آپؐ نے فرمایا روزے رکھو۔ یہ جو بزرگوں کا کہنا ہے کم خوردن، کم خفتن، کم گفتن، اس کے بوتا پر نفس مرتا تو نہیں، اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،مگر اس میں ایسی جلا اور لطافت آجاتی ہے جو آنکھوں کی روشنی اور قلب کے ظرف کو پھیلا دیتی ہے۔ یہ تو رہیں عالم امکان کی باتیں۔اب ذرا حقیقت کی طرف رجوع ہوں۔جس طرح سورج مادی زندگی کا رب کہلایا جاسکتا ہے، اسی طرح روح کے نمود اور فروغ کا سورج، وہ شمس حقیقت ہے، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جس کا نور یکتا ہے، اور آپ ہی آپ اور چونکہ اس کی نمود آفاق سے نہیں بلکہ ذرّہ ذرّہ کے انفاس سے ہے اس لیے اس کا شعور اُس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک کہ انفاس اور آفاق کی توحید قائم نہ ہو۔ایک دیدار کے بعد جو بڑے بڑے اکابر بھی فراق کی بھٹی میں عمریں گذار دیتے ہیں، کاش کہ اس نور کی اکائی اپنا لیں تو پھر ظلمت کی تاریکی کہاں، فراق کہاں، 'تو' کہاں، اور 'میں' کہاں۔مگر وہاں مسلم اور مومن کو دو پیروں سے چلنا سکھایا ہے، دین اور دنیا۔ یہ آفاقی سورج جب غروب ہوتا ہے تو شب کی تاریکی خصوصاً طلوع سحر سے پہلے کی گھڑیاں، ذات کا صفات سے رابطہ قائم کرتی ہیں۔ وہ ذات نہیں ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ آرسی کی رسم ادا ہوتی ہے۔ یہ ولایت کا کیف ہے۔ یہ ایمان کا نکھار ہے۔ رہی نبوت کی روشنی، وہ علیحدہ بات ہے۔اس آفاقی دن میں مومن، عمل کے میدان میں ہوتا ہے۔حقیقت کے میدان میں عمل کیا ہے، ہر وقت یہ خیال، جس کو مقام احسان کہتے ہیں کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔اور پھر اس میں بھی کیف ہے اور جو کیف، مستی کی حد تک پہنچ جائے تو کون کسی کو دیکھتا ہے۔ خود بخود پھول سے خوشبو کی طرح وہ عمل سرزد ہوتے ہیں جس کو لوگ عمل صالح کہتے ہیں۔آخر یہ کیوں۔ نبیؐ ایک نمونہ ہے، پیروی کے لئے اور چونکہ ہر فرد کے باطن میں وہ شمس ٹمٹما رہا ہے، اس لئے ہر کسی کا رجحان طبعاً نیکی اور فروغ کی طرف ہے۔ یہ وہی مقام ہے، جہاں حضرت علیؓ کے الفاظ مطابقت کرتے ہیں کہ ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ'' اور اسی لئے جب نمونہ دیکھتے ہیں تو خود بخود ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ سچ ہے اور ٹھیک ہے۔ یہ وارثان نبیؐ گویا ان ہی کی زندگی کی وسعت میں بسے ہوتے ہیں۔شب یٰسٓ تو صبح طٰہٰ

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔

جب شمس حقیقت اپنی جان میں نصف النہار پر نہ ہو یا ادب اور حیاء کے پردے حائل ہوں تو پھر ایک چاند بھی ابھر آتا

ہے۔اس کا وجود بھی ظاہرو باطن دونوں میں ہوتا ہے۔ چاند کا گھٹنا اور بڑھنا، اس میں بھی نشانیاں ہیں،فکر کرنے والوں کے لئے۔ یہ چاند اپنا پیر ہوتا ہے کبھی مرید پر شغل مستی چھا جاتی ہے، اورپیر کی مراد بن جاتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے، میں پیر ہوں، چودھویں رات کا چاند ہوں۔کبھی تاریک رات آتی ہےتو کہتا ہے کہ 'میں غلام ہوں' بندہ ہوں' یہ طوق میرے گلے سے نہ نکالیے، یہ گھٹنا اور بڑھنا ضروری ہے ورنہ ایسی مستی چھا جائے کہ شمس حقیقت کی روشنی سےمحروم رہ جائے اورنبوت کے کار زارعمل میں ناکارہ ثابت ہو جائے۔ جب چاند بھی پردوں میں ہوتو اندھیری رات میں آسمان پر تارے کس حسن وخوبی سے جگمگاتے ہیں۔ آسمان کا حسن خودایک منفرد چیز ہے، پھر یہ ستارے۔ یہ وہ اکابر بزرگان دین ہیں جس سے محبت اورعقیدت ہر جویائے حق کے لئے لازمی ہے اورہوتی ہی ہے۔کوئی دوئی کا سوال نہیں۔کبھی آپ نے ایک صالح نوجوان کی ہوک اور نامعلوم تلاش کوبھی اپنایا ہے۔ظاہری اور باطنی ہرقسم کی صلاحیتیں درجہ اتم تک موجود ہوتی ہیں، مگر بے رخ۔اس زندگی میں وہ تاریک رات ہوتی ہے، جب سیاہ بادل بھی آسمان پر چھائے ہوتے ہیں۔مگر جب حسن کی پہلی کرن اس کے قلب ونظر کو پار کر جاتی ہےتو ساری صلاحیتیں ایک رخ ہو جاتی ہیں۔اس کی قسمت اگر کوتاہ ہے،تو ایک دنیوی لحاظ سے خوش نصیب بھی ہے۔زندگی کے زوج میں گرفتار ہوتا ہے اور ''عمرے باید کہ یار آید بکنار'' قسمت اگر بلند ہےتو پھر اس کی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ مجازتو ایک نشانی ہے، حقیقت کچھ اور ہے۔کبھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک ساتھ آسمان پر سورج بھی ہوتا ہے اور چاند بھی،خصوصاً غروب آفتاب کے وقت مشرق کے افق پر چاندنکھر آتا ہے۔شمس حقیقت، اس کا نمودتو باطن جان میں ہے۔اس کےغروب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔مگر یہ کس کے نصیب میں کہ دائم قائم وہ قلب و روح میں نصف النہار پر ہو۔ ہاں قلب سے گزار کر جب ''قُم باذنی'' سے روح کوقیام ملاتو یہ وہ صبح صادق ہوتی ہے جہاں نہ سورج نظر آتا ہے نہ چاند،مگر ایک ایمان بالغیب ہوتا ہے کہ یہ سورج کی کشش ہی ہے جس نے مجھے کھینچ کر نکالا۔سورج کی تاب کون لا سکتا ہے، جب حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر نبیؑ بھی ایک ادنیٰ پرتو کی برداشت شائد نہ کر سکے۔حق جہاں بے نام ونشان ہے وہاں نام ونشان بھی ہے۔ یہ جو برقِ طور کہلاتی ہے اس شمس حقیقت کی ایک ادنیٰ تجلّی تھی۔

دن اور رات کے یہ زوجین صرف شعور اورعقل کی باتیں ہیں ورنہ تاریکی بھی کوئی چیز ہے جس سے آپ جہاد کریں یا بھگا سکیں یا اس کو مار سکیں۔صرف روشنی کے نہ ہونے کوتاریکی کہتے ہیں۔اسی طرح خوبی کے نہ ہونے کوخرابی کہتے ہیں اورخیر کے نہ ہونے کوشر۔منفی، منفیت بذات خود نہ کوئی صفت ہے نہ اس کی کوئی حقیقت ہے۔جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے جتنے اعلیٰ اقدار

ہیں جن کو ہر کوئی، کسی تہذیب اور تمدن کا، تاریخ کے کسی دور کا ہو، کسی مذہب ملت کا ہو، آخر کیوں مانتا ہے، کہ یہ حق ہیں۔ وہ اس لئے کہ اس کا شعور تک اس کو بتاتا ہے کہ یہ وہی اقدار ہیں جو ذات قیوم کے پرتو ہیں۔ کسی نے خوب کہا کہ خوبی اور نیکی کے حق ہونے کا ثبوت صرف یہی ہے کہ وہ قائم رہتے ہیں۔ ظلمتیں خود بخود چھٹ جاتی ہیں۔ اسی لئے جو فقراء روشنی کے پروردہ ہیں، ان کا فرمان ہے کہ تم اپنی کمزوریوں، اپنے نفس کے تقاضوں، اپنی الجھنوں اپنے بے ماگی کی طرف نہ دیکھو بلکہ ان مثبت صفات کی طرف توجہ رکھو۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ گو ہم ان صفات کو مانیں مگر وہ صفات عملاً ہم کو اپنے رنگ میں ڈھال نہیں سکتیں جب تک کہ اس اجسام صفات نوری کی طرف رجوع نہ ہوں جو وجود میں ہو۔ آخر کچھ بت پرست جانتے ہیں کہ روشنی ایک چیز ہے مگر پرستش کرتے ہیں سورج کی۔ موجود، وجود کو طلب کرتا ہے۔ اس کے بغیر بات نہیں بنتی۔ بغیر وجود کے جُود کیسے ہو۔ ہاں شمس تک وجودی رسائی کس کس کے نصیب میں۔ البتہ چاند تو میسر ہے وہ بھی اس روشنی سے بنا ہوا ہے اور وجود کی تشفی بھی ہے۔ اس لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ اویسیؓ طریقہ سے جو کچھ بھی تم کو ملا ہو یا ملتا رہے پھر بھی ایک وجود کے طالب ضرور بنو اور ہاتھ میں ہاتھ ضرور دو، تا کہ رابطہ جود قائم ہو جائے۔ یہ رابطہ ایسا ہے جیسے کہ دو مومن مسلم دوش بدوش چلتے ہیں کسی متعین مقصود اور منزل کی طرف۔ اس طریقہ میں ولایت اور نبوت دونوں کا پرتو ہے۔ نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا ہے۔ سب بھائی ہیں، دوش بدوش چل رہے ہے۔ جب غیریت کے پردے اٹھ جائیں تب دوش بدوش چلتے ہیں۔ یہ مومن کی نشانی ہے۔ دوش بدوش چلنے کا مزہ ان سے پوچھو جو چلتے ہیں۔ اسے زوج کی اصطلاح میں ساتھی کہتے ہیں۔ یہ دوستی سے بھی اونچی چیز ہے اور اس میں بے پناہ محرک قوت ہے۔ بقول علیؓ شیر خدا کے ''تم خود اپنے وجود پہ غور کرو اور فکر کرو تو کائنات کا کوئی ایسا رمز یا راز نہیں جو آشکار نہ ہو جائے'' دو آنکھیں دیں تم دیکھتے ایک ہو، دو کان دئے تم سنتے ایک ہو، دو ہاتھ دعا کے لئے اٹھتے ہیں اور ایک ہی مخاطب ہوتے ہیں، دو پیر دیئے اور ایک ہی منزل کی طرف گامزن ہیں۔ اسی طرح ناک کے دو نتھنے ہیں اور سونگھنے ایک ہیں تو پھر یہ دو کیوں۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ اگر پیدائش ایک آنکھ سے دیکھے یا ایک کان سے سنے تو دیکھ بھی لیتے ہیں اور سن بھی لیتے ہیں، مگر ایسے جیسے کہ ایک تصویر، سپاٹ، فاصلے کا اندازہ نہیں ہوتا۔ سہ جہتی اثر کے لئے دو آنکھیں، دو کانوں کا ہونا ضروری ہے۔ انسان کے جسم میں تین اور چیزیں ہیں جو اکائی میں ہیں، زبان، قلب، اور عضو، جب پتہ پتہ سے لے کر ملائک تک تحلیل و تسبیح میں ہیں تو کیا ہم ان سے بھی گئے گزرے ہیں کہ زبان سے صدق کے علاوہ کوئی اور چیز بھی نکلے، قلب، بقول حسینؓ، کے مسافر خانہ نہ ہو بلکہ کسی کا گھر بنا ہوا ہو تو واحد کی وحدت کو نبھانے کا یہی متحمل ہو سکتا ہے۔ یہی وحدانیت کے پہلو ہیں ''اِقرَ ابِاللِسَان وَتَصدِیق'' بِالقَلب'' ایک صفت حقیقت ہے، ایک صفت ذات رہا عضو، تو یہ بہت بڑی نشانی ہے تو حید زمانی کی، کہ زندگی میں

کتنی ہی کثرت ہوئی اور حیات ایک ہے۔

انسان کے اندر جو نفس یا ابلیسی صفات ہیں اور روح کی جو ملکوتی صفات ہیں، یہ مقناطیس کے دو قطب کی طرح ہے کہ ایک کبھی نہیں رہ سکتا۔ زندگی دو قطبی ہے، اسی لیے زوجین قرآن میں آیا ہے۔ ان دونوں کی میزان زندگی ہے، جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مگر ہماری توجہ کبھی مثبت صفات پر ہوتی ہے، کبھی منفی پر۔ میزان قائم کرنے پر نہ فکر کرتے ہیں، نہ عمل۔ انسان کی دوسرے حیوانوں پر فضیلت اس لئے ہے کہ دماغ، قلب، روح کی صلاحیتیں بخش کر ایک امتیازی شرف ملا ہے۔ نفس کل کی دنیا میں کیا رکھا ہے۔ قلب و روح کی دنیا میں اٹھیں تو اسماء و صفات کی تجلیوں میں آئیں۔ اسی انسانی زندگی میں اسماء و صفات کار مزپانے کے لئے طبق اپنے وجود پر غور کریں۔ یہ طبق در طبق سات ہیں۔

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	اور اٹھواں
مادہ	توانائی	جان	قلب	روح	روح اعظم	سرخفی اخفا	ب کا نکتہ
							غیب حقیقت
							ھو لاہوت

اسی طرح اَلْحَمْد میں سات طبق ہیں اور آٹھواں بھی سبع صفات کا کن فکان، تحت العرش، فوق الارض یہی سات صفات ہیں۔ قطب عالم ان ہی سات سے مزین ہے۔ اسماء کا رمز اور کیف پانے کے لئے ایک انسان کی مثال لیں۔ جب تک اس کا نام نہ معلوم ہو اسے (ھو) وہ کہہ کر اشارہ کرتے ہیں۔ اسم کو لیں تو کسی شخص کا نام اس کے تعارف شخصی، اس کی یکتائی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور جب اسم با مسمّٰی ہو تو اس کی خصوصیت شخصی اس کے ذریعہ بیان ہو رہی ہوتی ہے۔ اب وہ شخص سامنے ہو نہ ہو، اسم ہی اس کی نشاندہی کر رہا ہوتا ہے۔ یہ اس کا ذاتی اسم ہے۔ جب تک اس تک رسائی نہ ہو اسے اسی نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ آمنا سامنا ہو تو نام بھی لینا بے ادبی ہے۔ اب اس اسم والے کی صفات اور خصوصیت بیان کرنی ہوں تو ان کے لئے دوسرے اسماء صفاتی کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے دیکھنے والا، بولنے والا، سننے والا، زندہ، علم والا، قدرت والا، ارادے والا۔ پھر اس کی دوسری صفات بیان کریں تو نام بے شمار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے خصوصی اسمائے صفاتی سات ہیں، ''حَیّ'' ''قَدِیْر'' ''مُرِیْد'' ''بَصِیْر'' ''سَمِیْع'' ''عَلِیْم'' اور کل اسمائے حسنیٰ 99 ہیں۔ یہی کچھ انسان کی ہستی میں بھی اپنی جھلک دے رہے ہیں آخر تو ہے نا، ''خَلِیْفَۃُ اللہ فِی الْاَرْضِ'' ایک نکتہ پر غور کریں کہ سبع صفات یا اسمائے حسنیٰ میں سے کوئی ایک بھی صفت لی جائے جیسے دیکھنے والا، تو بغیر کسی وجودی شکل کے اس لفظ یا اسم اسم کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ حال ہی میں سید عبدالحلیم اثر نے حروف مقطعات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کو سریانی، پشتو، عبرانی زبانوں پر عبور ہے، اور کافی ریسرچ کے بعد انہوں نے اپنے مطالعہ کو موجودہ زمانے

کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس جگہ عبدالحلیم صاحب کی اجازت سے حروف مقطعات کے بارے میں کچھ بیان کر دینا بے جا نہ ہوگا۔ان کی نئی تحقیق کے مطابق حروف مقطعات کا تعلق سریانی زبان سے ہے جو روح کی زبان ہے۔اور اہل اسلام میں لوگ ان حروف سے واقف تھے، اسی لئے کفار نے نکتہ چینی نہ کی، گو ان کی نظر ان کے سطحی معنوں سے آگے نہ جاسکتی تھی۔ان حروف کا مقطع ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں سے ہر ایک حرف ایک بامعنی کلمہ ہے، جس میں مختلف حسن معانی کا اظہار مختلف سطحوں پر ہے۔عقل ونفس کی سطح لیں یا قلب و روح کی،تو ہر جگہ ان کی تجلّی ایک تراشے ہوئے ہیرے کی طرح نظر آئے گی کہ اس کی ہزاروں سطحیں ہیں اور ہزاروں انوار۔ان کا حسن، ان کا بانکپن، ان کا سراپا، ان کا کیف ایک عاشق کے لئے ہزاروں کناؤں، اشاروں اور گوہر معانی سے پر ہے۔اسی لئے کوئی بھی زبان ان کی تشریح سے قاصر ہے۔ان ہی حروف کے راز سربستہ میں تجلیات باری تعالیٰ کے انوار بھی ہیں۔ان ہی میں احسن تقویم کے باطنی حسن وخوبی کی چمک دمک ہے۔ان ہی میں ان ذاتِ گرامی سے نسبتوں کا اظہار ہو رہا ہے، جو ذات باری کے بے شمار عنوانوں کا مظہر ہے۔صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم" ان ہی حروف مقطعات سے وحدت وجود بہ کلی حسن شہود اپنی رعنائیوں کا "کُن فَیَکُون" کی صورت میں اظہار کر رہا ہے۔ان ہی مخفی الفاظ میں نورمحمدی کی تجلی ظاہر باطن کائنات میں بتائی جارہی ہے۔اس انداز بیان کو نہ کوئی دنیا کی زبان ادا کرسکتی ہے نہ عربی،عبرانی، نہ سریانی۔ یہ باتیں مقامات روح،سر،خفی، اخفا سے تعلق رکھتی ہیں۔اس لئے روح کی سریانی زبان کے ذریعہ ان کی طرف کچھ اشارے کیے جا سکتے تھے۔ اُن کی فہم اُن کا عرفان تو کسی اور سطح سے ہونا تھا یہ کم از کم وحدت الوجود کے کیف کی بات تھی یہ عالم عشق و امر کی بات تھی اس لیے الفاظ کے ذریعے کیسے بیان ہوتی۔تب ہی تو ان حروف کے معانی نامحرموں کے لئے کیا حقیقت رکھ سکتے ہیں، کو محرموں کے لئے یہ ایک کھلا دیوان ہیں۔ان حروف مقطعات کے گوہر معانی تو ان عشاقان، ان شہسوارانِ توحید پر روشن ہیں، جو اپنا لئے گئے ہوں۔ یہ کلمات تو ان کے محبوبؐ کی شان اور توصیف کے بیان میں ہیں اور محبوبؐ کے ساتھ یکتائیت توحید حاصل ہونے کی وجہ سے خود ان پر وارد ہیں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

عبدالحلیم صاحب کے مطابق سریانی زبان میں ان حروف کے معانی دیکھے جائیں تو ایک ایک حرف ایک کلمہ ہے، بیان

ہے۔

حٰمٓ۔اشیاء کا احاطہ اور سب پر شمولیت کے، وہ اللہ جس نے بارش کے پانی کی طرح آیت آیت کر کے متواتر اور متوالی وحی کے ذریعہ نازل فرمایا ہے۔

طٰسٓمٓ۔گلا گھونٹنا حرام ہے۔روشنی برسنے کو ہے۔یہ ہیں واضح نوشتے کی آیتیں مگر تم شاید اپنا گلا گھونٹ لو گے اس لئے کہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ہم چاہیں گے تو آسمان سے ان پر ایسی آیت اتاریں گے جس کے لئے ان کی گردنیں جھک جائیں گی۔اور یہ تو ہمیشہ ہوا ہے کہ لوگوں کے پاس جب بھی کوئی نصیحت آئی تو لوگ اس سے منہ موڑنے لگے۔چنانچہ ان لوگوں نے بھی جھٹلایا۔سو اب ان کے پاس اس کی خبریں آنے ہی کو ہیں جس کا یہ لوگ مذاق اڑاتے ہیں۔

الٓمٓ۔اول ہے، بزرگ ہے، واحد ہے، معبود حقیقی ہے، جس کی وحدانیت صحیفوں میں بیان کی گئی ہے۔وہ جو کہ اپنی ذات میں ہوئیت واحدی رکھنے والا احد ہے، واحد ہے، ''وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ'' ہے، وہ جس نے بارش کے پانی کی طرح آیت آیت کر کے متواتر اور متوالی وحی کے ذریعہ نازل فرمایا ہے۔

کٓہٰیٰعٓصٓ۔اے میرے ذی عزت واحترام بندے، آپ کو ان تمام لوگوں کی طرف، جو اس خلاء محشر میں جمع ہیں، ضرور جانا پڑے گا۔ان انوار کے ساتھ جن سے ان کے وجود قائم ہیں تا کہ وہ آپ سے مستفیض ہوں۔کیونکہ ان سب کا اصل مادہ آپ ہی سے ہے۔

یہ اور دوسرے حروف مقطعات اپنے ظاہری معانی کی خوبی میں ہی کیا کم تھے۔ان میں سے ہر ایک کے بعد آنے والی سورتیں ان کی وضاحت کے طور پر ہی ہیں۔مختصراً یوں سمجھ لیں کہ ان کے ذریعہ روح کو پیمان الست یاد دلایا گیا ہے۔اس نور محمدیؐ سے جو جاری و ساری ہے۔اس کی نسبت اور انسیت اور یکتائی وجود یاد دلائی گئی ہے ساتھ ہی اس کے جسم کی ظاہری اور باطنی خوبیوں کو پاک و صاف کر کے ''خَلِیْفَتَہٗ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ'' کے مقام تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ایک عاشق کے لئے اس سے زیادہ انعام واکرام اور احسان کیا ہوسکتا تھا، کہ وہ ظاہر، باطن اور ستر ہزار پردوں میں بھی اپنے محبوبؐ کا جلوہ دیکھ سکے۔

مصر کے مشہور صوفی بزرگ حضرت عبدالعزیز بن مسعود دباغؒ فرماتے ہیں، حروف مقطعات میں سے ہر حرف کے اسرار ہیں، ہر حرف کے سات اسرار ہیں جو معانی سابقہ کی مناسبت سے پیدا ہوتے ہیں۔نیز سات اسرار اور بھی ہیں جن سے عربی زبان کو مناسبت ہے، لیکن جب کلام غیر عربی ہو تو اس کے مناسب اور اسرار ہیں۔خدا ہمیں ''مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ'' کے طفیل توفیق اور علم دے۔حضرت دباغؒ فرماتے ہیں کہ اہل کشف یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سید الوجود سے نکل کر بادہ نور، نور کے

ڈوروں کی شکل میں تمام مخلوق کی طرف جاری ہے اور انبیاء اور فرشتوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح یہ اہل کشف استفادہ کی عجیب وغریب کیفیت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مثلاً ایک صالح شخص نے کھانے کے لئے روٹی کا ٹکڑا لیا اور اس میں وہ نعمت نظر آئی جو بنی آدم کو عطا کی گئی ہے۔ تو اس روٹی میں نور کا ڈورا نظر آیا۔ اس نے اس نور کا جو ڈورے اور دھاگے کی شکل میں نظر آرہی تھی پیچھا کیا تو دیکھا کہ اس نور کے ڈورے سے جاملا جو نورِ محمدیؐ سے جاملا تھا۔ پھر دیکھا یہ نور کا ڈورا ایک ہے پھر تھوڑی دور تک جا کر ڈوروں کی متعدد شاخیں نکلنی شروع ہوگئیں۔ ہر شاخ اس نعمت سے ملی ہوئی تھی، جو ان ذرات کو عطا کی گئی تھیں۔

یہی بات اسم کی ہے اور یہی صفت کی۔ اسی لئے تمام اسماء وصفات کے اظہار کی تابانی اسی نورِ محمدیؐ کے طفیل ہے۔ اس نورِ محمدیؐ کے اظہار کے لئے وجود کا ہونا ضروری ہے۔ خواہ وہ وجود انفرادی ہو یا وجود کلی۔ اور یہ بھی ہے کہ کسی مظہر میں ان اسمائے صفات کا اظہار ایک وحدت کلی میں ہوتا ہے، ایک وحدت وجود میں، ایسی ہستی کے لئے۔ فرد کی سطح پر بھی وحدت وجود ہے اور کائنات عالم کے ذرہ کی سطح پر ''عَلٰی کُلِّ شَیءٍ'' کی صورت میں بھی وحدت وجود۔ یہ نہ دیکھنے کی بات ہے، نہ سمجھنے اور تدبر کی۔ یہ ایک کیفیت کا سا انداز ہے جو وحدت کلی والے کو نصیب ہے۔ یہ وحدت وجود کا کیف ہے، کیسا پڑھنا پڑھانا، بس وہ تو 'ہے' کی کیفیت ہے۔ نہ اس کے لئے الفاظ ہیں نہ اور کوئی بیان اور شہود کی صورت۔

یوں کسی کو یاد کرو تو شکل سامنے آجاتی ہے۔ شکل بھی غائب تو اسم سے اس کی یاد ہو جاتی ہے۔ یا داوسرمایہ ایمان بود۔ یادکرتے کرتے اس کا رنگ اپنے میں سمانے لگتا ہے۔

جب اسم کو سمو کر محبوبؐ کی ذات کو اپنے میں سمولیا تو شدت ذکر میں محبوبؐ ہی اپنے میں بس گیا۔ جب تعینات کے پردے ہٹے تو 'میں' تو کو کا فرق اٹھ گیا۔ سب نسبتیں اٹھ گئیں۔ تو بس 'وہی ہے' غیر کی گنجائش کہاں۔ شرک کون کرے، کس کا کرے، یہاں عشق نے اپنا سب کچھ بھسم کر ڈالا۔ باقی ہے تو محبوبؐ کی صورت ''یَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ'' اس سے ایک قدم آگے دیکھنے والے کو بھی اپنا احساس نہیں ہے۔

؎ نظارہ نظر میں شامل ہے۔ نظارہ میں شامل کوئی نہیں۔

بس ایک جلوے کی لطافت ہے، کیف ہے، مادیت سے ماوراء۔ وحدت شہود ہے، وجود سے ماوراء یہاں صفات بھی غائب، اسماء بھی غائب، بس ہے کی کیفیت ہے، لذت ہے۔ یہ تو رہیں حقیقت تک رسائی کی باتیں۔ مگر عام مسلمان کے لئے دین کی منزل پر شدت لانے کے لئے اسم گرامی نبی کریمؐ وہ سادہ نسخہ ہے جس کی حمیّت اور غیرت ہر کلمہ گو کے رگ و پے میں سمائی ہے۔ اس کی حرمت وعزت کی خاطر وہ از خود رفتہ ہو کر سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ درود تاج اسی ذات مبارک سے شعوری

اور لاشعوری رابطہ قائم کرانے کا ذریعہ ہے۔مسلمان کو ''مِن خَیرُ القوم'' اسی درود تاج کو اپنی مشعل ہدایت و استعانت بنانا ہے۔جتنی جس کے نصیب میں۔ یہ اور بات ہے کہ ہر سطح کے افراد کے لئے اس کی لطافتیں اور انوار جدا ہوں۔مگر رحمت عام ہے، بلا تخصیص ہے۔فقراء کو تو حید فکر اسی کے طفیل نصیب ہے، ایک والہانہ، عاشقانہ نسبت اور رابطہ ایک قلندر ہی جانتا ہے۔ ہر اسم کی حقیقت اپنانا، ہر اسم کی حقیقت کو سمونا، ہر اسم کی حقیقت ہو جانا، قلندر ہی کا حصہ ہے۔ یہی جذبہ قلندرانہ کچھ نہ کچھ حد تک اس قوم کے رگ و پے میں صدیوں سے سمایا ہے۔ نبی کریمؐ پر ایمان کی یہ رحمت کن، اسلام کے پیرویان کے لئے عام ہے۔عقل کی دنیا سے نکل کر دل کی دنیا سے نکل کر دل کی دنیا میں اسی حقیقت کو پاجانا ہے۔ فی زمانہ قوم کے لئے یہی ایک نصب العین اور رابطے کی بات ہے۔